۳

اسلام اور دور حاضر کا نظریاتی بحران

مذاہب اور نظریات - تاریخی پس منظر

بنی نوع انسان کی تاریخ کا معروضی مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی مجبور ہے کہ سوالات اٹھائے: مثلاً میں کہاں سے آیا ہوں؟ میں یہاں کیوں موجود ہوں؟ مجھے یہاں سے آگے کہاں جانا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ ناگزیر سوالات ہیں جو ہم میں سے ہر کسی کو فلسفی بنا دیتے ہیں، خواہ ہمیں اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

ان بنیادی سوالوں کے جوابات کی تلاش نے مختلف دیو مالاؤں، لوک قصے کہانیوں اور تخیل کی دوسری ہیئتوں کو جنم دیا۔ رفتہ رفتہ تخیل کی یہ صورتیں --- جو اس جہاں کی تعبیر کی کوشش تھیں --- باقاعدہ مذاہب میں تبدیل ہو گئیں۔ معلوم قدیم ترین مذاہب جو اب تک باقی ہیں ان میں تاؤازم، ہندومت اور بدھ مت شامل ہیں۔ شمن پرستی کی مختلف شکلوں کو بھی نظر انداز نہ کیجیے، [جس میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ مذہبی پیشوا یا کاہن بدروحوں کو قبضے میں رکھ سکتا ہے۔]

شرک اور اصنام پرستی (Polytheism) نے اس وقت سر اٹھایا جب لوگوں نے بجلی کی کڑک، سورج، آگ، عمل تخلیق اور موت جیسے فطرت کے انفرادی مظاہر کو مابعد الطبیعاتی قوتیں سمجھا۔ ایک لحاظ سے اس طرح کی کثرت پرستی پر امن ہے، اس لیے کہ اس میں عالمگیریت کا ارادہ شامل ہی نہیں۔ ہر فرد اپنے دیوی دیوتاؤں کے مخصوص سلسلے سے مطمئن رہتا ہے۔

بہر طور شرک کی فطرت میں توحید کی جانب میلان کا نقش بھی قائم رہتا ہے۔ جب کوئی قبیلہ اپنے ہمسایہ قبیلے پر فتح پا لیتا ہے تو فاتح اپنے برتر دیوتا (deity) کو سامنے لے آتا ہے اور مقامی

دیوی دیوتاؤں کو کم تر مقام پر بٹھا دیتا ہے۔ اسلام سے قبل عرب دنیا میں یہی صورت حال تھی، جہاں ''الٰہ'' کے علاوہ ثانوی دیوتاؤں، لات، منات، اور عزیٰ کی پوجا کی جاتی تھی۔ ''الٰہ'' جسے مسلمان اللہ تعالیٰ کہہ کر پکارتے ہیں، عربوں کا سب سے برتر ''دیوتا'' تھا۔

توحید کے ظہور کے ساتھ مذہب کی تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ اس کا پہلا مختصر دور اخناتون کی حکمرانی میں مصر میں آیا اور بعد ازاں بنو اسرائیل کے دور میں--- یہودیوں کے تصور توحید کی تغلیط و تردید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ ان کا قبائلی خدا ہی دنیا کا خدائے واحد ہے۔ اگر خدا ایک ہی ہے تو اسے لازماً ہر کسی کا خدا ہونا چاہیے نہ کہ صرف ایک برگزیدہ قوم کا خدا۔ چنانچہ یہ امر صریحاً منطقی تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد سینٹ پال نے یہودا (خدائے واحد) کے عقیدے کی عالمگیریت پر اصرار کیا۔

تاریخ کے اس موڑ پر، مذہب کی عالمگیریت کے آغاز کے ساتھ ہی بنی نوع انسان اپنی تاریخ کے سب سے زیادہ خونریز عہد میں داخل ہوگئی۔ ایک خدا اور ایک چرچ کے مسیحی تصور کے مطابق اس دائرے سے باہر نجات کی کوئی راہ نہیں تھی۔ کیتھولک چرچ اس عقیدے سے، جسے لاطینی زبان میں (extra ecclesiam nulla salus) کا نام دیا جاتا ہے، دوسری ویٹی کن کونسل منعقدہ ۶۶/۱۹۶۵ء تک ۱۹۰۰ برس وابستہ رہا۔ اس عقیدے کی بنیاد پر مسیحیت--- جسے محبت پر مبنی مذہب تصور کیا جاتا ہے--- جارحانہ نفرت کی علم بردار قوت بن گئی۔ اس نے ہر مسلک اور مذہب کا وجود مٹانے کی ٹھان لی، خواہ وہ مسلک بظاہر عیسائیت ہو، یہودیت ہو یا دین اسلام - لہٰذا جرمن (Germanic) قبائل کا قتل عام مسیح علیہ اسلام کے نام پر کیا گیا اور القدس میں صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ ''جادوگرنیوں'' اور نام نہاد ملحدوں کو زندہ جلا ڈالا گیا۔ آرتھوڈکس مشرقی مسیحیوں کو باغی قرار دے دیا گیا اور سپین کی سرزمین سے تمام یہودیوں اور مسلمانوں کو دیس نکالا دے دیا گیا۔

چنانچہ اس المناک دور میں جو ۷ ویں صدی کے بعد تک جاری رہا، مسیحیت کو پہلی بار ایک آئیڈیالوجی یعنی قوت کے مظاہرے کو جائز قرار دلانے اور حرکت میں لانے کے لیے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کسی حد تک اسلام کو بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اسلام بھی مدینہ، دمشق، بغداد، مراکش اور استنبول سے چاروں طرف پھیلتی ہوئی ایک ایمپائر بن گیا جو طاقت کے معاملے میں بہت حساس تھی۔

یہ سچ ہے کہ وہ جنگیں جو مسلمانوں کو جنوبی فرانس اور ویانا کی طرف لے گئیں، ان کی ایک مذہبی بنیاد بھی موجود تھی۔ لہٰذا صرف اس دور کی حد تک اسلام کو عیسائیت کی مقدس جنگوں کے روپ میں پیش کرنا سراسر غلط بھی نہیں ہے۔ یہ بات ہمیں اچھی لگے یا بری لیکن مقدس جنگیں، جنہیں ہم کم تر جہاد (جہادِ اصغر) کا نام دیتے ہیں ان میں اسلام کو ایک آئیڈیالوجی یعنی حصول طاقت کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔

نظریات کی صدی

لیکن ۱۸ ویں صدی کے بعد ہی ہم حقیقی نظریاتی دور میں داخل ہوتے ہیں، جب عقلیت اور جدیدیت کے تصورات کا دور شروع ہوا۔ اس حد تک کہ ''روشن خیالی'' کے مقابل مذہب کا تصور عوامی شعور سے محو ہو گیا اور عملاً نظریات نے مذہب کی جگہ لے لی۔ سیکولر نظریوں نے جن کا مذہب سے کوئی رشتہ نہیں تھا، خود مذاہب کی شکل وصورت اختیار کر لی۔ یہ بات ۱۹ ویں صدی کی رومانویت پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے، جس طرح اثباتیت (Positivism) پر، جسے سائنٹزم بھی کہا جاتا ہے۔ تاہم مارکس، اینگلز اور لینن کے ہاتھوں تشکیل پانے والی مارکسزم پہلی آئیڈیالوجی سمجھی جا سکتی ہے۔

مارکسزم نے زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک مکمل نظریہ پیش کیا جو مادی جدلیات کے ذریعے فطرت کے عمل کی اور تاریخ کی مادی تعبیر (Historical Materialism) کے

ذریعے سوسائٹی کے عمل کی وضاحت کرتا تھا۔ مارکسزم نے مذہب کی طرح اپنے پیروکاروں کو مکمل طور پر اپنے سانچے میں ڈھالنے اور کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور ان سے اخلاقی طور پر اس کا پابند رہنے کا تقاضا کیا۔ دہریت کی گہری چھاپ کے باوجود مارکسزم میں مذہب کے کئی رنگ شامل تھے۔ کمیونزم کے منشور اور داس کیپٹل کو مقدس دستاویز اور مارکس، اینگلز اور سٹالن کو سوشلسٹ دھرم کے پیام بروں کا مقام دیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی عملاً معصوم عن الخطا چرچ کے طور پر اور پولٹ بیورو کے ارکان اس کے پادریوں کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بہشت کے تصور کو ایک ایسے غیر طبقاتی مستقبل کے تصور سے تبدیل کر دیا گیا، جس میں ہر فرد کو اپنی ضروریات کے مطابق معاوضہ ملے گا اور کام تفریح میں بدل جائے گا۔

اٹلی، جرمنی، سپین، پرتگال اور یونان میں فسطائیت کی مختلف شاخوں نے اسی اشتراکی وژن میں نسل پرستی پر مبنی شاونزم کی تیز خوراک بھی شامل کر دی تاکہ اس کی مدد سے یہودیوں، جپسی نسل کے لوگوں اور مشرقی یورپ کی سلاف نسل کے خلاف شرمناک جرائم کا جواز اور تحرک پیدا کیا جا سکے گویا مذہب ہمیشہ موجود رہا۔ ''میری جدوجہد'' جرمنی میں مقدس دستاویز اور ہٹلر کی شخصیت نجات دہندہ قرار پائی کہ وہ ملک کو ایک خوشحال دور میں لے جائے گا اور یہ ایمپائر ۱۰۰۰ سال تک قائم رہے گی۔ یہاں بھی نازی پارٹی کا وجود چرچ کی مانند موجود تھا۔ اور اسی کو یہ بتانے کا اختیار حاصل تھا کہ کیا حق ہے اور کیا باطل اور ایس ایس دستوں کو مذہبی تنظیموں کے اسلوب میں منظم کیا گیا تھا۔

مارکسزم اور فاشزم کے ردعمل میں دوسرے نظریات (Ideologies) پوری قوت کے ساتھ ابھرے۔ میری مراد مغربی لبرلزم سے ہے جس میں سرمایہ داری (کیپٹلزم) اور فرانسیسی طرز کی لائیسزم شامل ہیں، جس کی رو سے اجتماعی زندگی میں سے مذہب کی جڑ کاٹنا ضروری ہے۔ نو آبادیاتی دور کے بعد عرب دنیا میں نیشنلزم، لبرلزم، فاشزم اور سوشلزم غرض یہ کہ تمام مغربی نظریات کو آزمایا گیا لیکن سب بری طرح ناکام ہو گئے۔

اس پس منظر میں بیسویں صدی کو نظریات کی صدی (Ideological Century) کہا جا سکتا ہے۔

بے مذہب تہذیب کی تباہی مقدر ہے

اب ہم اپنی توجہ اس مشترک عنصر پر مرکوز کرنا چاہیں گے جو انیسویں اور بیسویں صدی کے تمام نظریات کی پہچان ہے۔ یہ سب نظریات مادیت پر مبنی تھے، ان کا مطمح نظر سیکولر تھا اور ان کی بصیرت وحی و الہام سے خالی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی بنیادی انسانی سوالات کا جواب نہ دے سکا، یعنی انسان کہاں سے آیا؟ کیوں آیا اور کس طرف جا رہا ہے؟

عقلیت پسندی کے دور میں اور اس کے جلد بعد عمانویل کانٹ، آگسٹے کومٹے اور فریڈرک ہیگل جیسے فلسفیوں کا خیال تھا کہ انسان مذہب سے آزادی حاصل کرنے کے بعد تنہا اپنی عقلی صلاحیتوں کی مدد سے اس دنیا کا آقا بن سکتا ہے۔ عقلیت پسندی بالآخر انسان کو خوشحال، پرامن اور انسانیت دوست دنیا کی ضمانت مہیا کر دے گی۔

اب ہم زیادہ بہتر جانتے ہیں اور اس پر حیران نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جدیدیت صرف عقل کے ذریعے انسان کی تخریبی جبلتوں پر قابو پانے میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ مذہب کو برطرف کر کے جنت ارضی کے بجائے ہمیں ناقابل یقین حد تک وحشیانہ عالمی جنگوں، کیمیائی اور ایٹمی جنگی اسلحہ، قتل و غارت اور نسل کشی جیسے مصائب اور تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ہمیں اس پر کوئی حیرت نہیں، اس لیے کہ بدیہی طور پر صرف مذاہب ہی انسان کو اس بلند سطح تک لے جا سکتے ہیں جہاں سے وہ اپنی ادنیٰ جبلتوں، شہوانی جذبات اور بے مہار انا پرستی پر قابو پا سکے۔ جب خدا کو بادشاہت کے مقام سے اتار کر خود انسان ہر چیز کا معیار بن بیٹھا تو تمام قوانین اس کی صوابدید پر منحصر ٹھہرے۔ اس عمل میں الوہی قانون کا نظریہ سرے سے رد کر دیا گیا لیکن سب کو ایک کھونٹے سے باندھ کر رکھنے والے ''فطری قانون'' کی تلاش کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔

ذہین مغربی مشاہدہ کار ایک نسل قبل اس تلخ نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اگر انسان مذہب کی بازیافت نہ کر سکا تو بنی نوع انسان نہ صرف اپنے آپ کو تباہ کر لے گی بلکہ اپنے ساتھ کرہ ارض کو بھی لے ڈوبے گی۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر دانیال بیل ۱۹۷۶ء میں یہ راز پا چکے ہیں، کہ کیپٹلزم کی اپنی فطرت میں خرابی مضمر ہے اس لیے کہ خود اس کی معاشی کامیابی ہی ان اقدار کو زہر آلود کر دیتی ہے جن کی بنیاد پر معیشت تعمیر کی جاتی ہے۔ چنانچہ بیل نے اپنی تصنیف ''سرمایہ داری کے ثقافتی تضادات'' میں اس بات کی تلقین کی ہے کہ اخلاقیات کی تعمیر نو کے لیے کسی نہ کسی طرح کا مذہب اپنانا ضروری ہے، خواہ ایسا کوئی مذہب خود ہی کیوں نہ ایجاد کرنا پڑے۔

اسی طرح امریکہ کے ایک سابق سفارت کار ولیم آفلس نے مغربی تہذیب کا بصیرت افروز تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں اپنی کتاب: *Requiem for Modern Politics - The Tragedy of the Enlightenment and the Challenges of the New Millenium. (Boulder, Colorado)* میں انہوں نے پیش گوئی کی ہے کہ مغربی دنیا بھی کمیونزم کی طرح مسمار ہوگی، کیونکہ یہ اعلیٰ بصیرت سے محروم ہے۔

دونوں اصحاب نظر نے فرسودگی کی حقیقت پالی ہے کہ کوئی انسانی تہذیب کبھی روحانیت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکی۔

اسلام- ایک نظریہ؟

اس پس منظر میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ ۲۰ ویں صدی کے ساتویں عشرے سے اسلام غیر متوقع لیکن نمایاں طور پر عالمی منظر پر ابھر آیا ہے۔ ایک ایسے دین سے کوئی کیا توقع رکھتا جس پر شیخ سرہندی، شاہ ولی اللہ اور محمد بن عبدالوہاب جیسی شخصیتوں کے باوجود ۴۰۰ برس سے جمود کی حالت طاری رہی ہو اور جس کے تمام ماننے والوں کو یورپی اقوام نے اپنی نوآبادیات میں شامل کر لیا ہو۔

مغربی مستشرقین کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا جب وہ اسلام کا مطالعہ اس انداز سے کر رہے تھے جیسے ماہرین حیاتیات معدوم ہو جانے والی انواع کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسلام میں ان کی دلچسپی تاریخ کے ایک موضوع سے زیادہ نہیں تھی۔ میکس ہیننگ (Max Henning) نے ۱۹۰۱ء میں جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھا۔ ''واضح طور پر اسلام کا سیاسی کردار ختم ہو چکا۔''

ہر شخص کا یہی خیال تھا۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ الافغانی اور محمد عبدہ، اسلامی احیاء کا پیغام لائیں گے۔ کوئی شخص یہ پیشین گوئی نہ کر سکا کہ علامہ محمد اقبال، حسن البنا، سید قطب یا ابوالاعلیٰ مودودی اور محمد اسد جیسے لوگ دعوت اسلامی کو مشرق و مغرب میں پھیلانے کا ذریعہ بن جائیں گے۔

لیکن حیرت ہے کہ آج آئس لینڈ سے نیوزی لینڈ اور کوریا سے کولمبیا تک دنیا کا کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جس میں سرگرم و فعال مسلمان موجود نہ ہوں۔ سو سال پہلے جو تعداد کے اعتبار سے دنیا کا ساتواں حصہ تھے اب دنیا کی آبادی کا بیس فیصد ہیں۔

اب لندن، پیرس، روم، ویانا، لزبن، زغرب، نیویارک اور لاس اینجلس جیسے شہروں میں نمائندہ مساجد قائم ہیں۔ مزدور کارکنوں کی نقل مکانی اور مغربی یونیورسٹیوں کی دلکشی کی بدولت لاکھوں مسلمان یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سرگرم عمل ہیں۔ ہر کہیں مسلمان دوسرا سب سے بڑا مذہبی گروہ بنتے جا رہے ہیں۔ آج کوئی اخبار یا ٹی وی پروگرام ایسا نہیں جس میں اسلامی موضوعات شامل نہ ہوں۔ اور صرف حال ہی میں یہ ممکن ہوا ہے کہ تمام یورپی زبانوں میں کلاسیکل اسلامی لٹریچر کی دولت دستیاب ہے۔ قرآن ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جس کا سب سے زیادہ ترجمہ کیا جا رہا ہے اور زمین پر جس کی تلاوت سب سے زیادہ کی جاتی ہے۔

چونکہ یہ سب کچھ نظریاتی بیسویں صدی (Ideological century) میں ہوا ہے، درآں حالیکہ بعض اسلامی تحریکیں بنیادی طور پر سیاسی مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں اور کچھ

درآں حالیکہ بعض اسلامی تحریکیں بنیادی طور پر سیاسی مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں اور کچھ مسلمان مایوسی کے باعث تشدد کی راہ پر چل نکلے ہیں، یہ سب بھی ان وجوہات میں سے ہیں جن کی وجہ سے اسلام کا حوالہ اکثر ایک آئیڈیالوجی کے طور پر دیا جاتا ہے۔ یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ اسلام بھی دنیا کے امور چلانے کے لیے تصورات کا ایک مجموعہ پیش کرتا ہے لیکن ہمیں اپنے عقیدے کا حوالہ ایک آئیڈیالوجی کے طور پر دینے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس اصطلاح سے نری سیاست اور ایسے دنیوی تصور کا گمان گزرتا ہے جس میں آخرت شامل نہیں۔

مذہب کا مستقبل؟

صورت حال کچھ بھی ہو، یہ حقیقت اپنے جگہ اہم ہے کہ تیسرے ہزاریے کے آغاز پر صرف دو نقطہ ہائے نظر باقی رہ گئے ہیں جو مغرب کے انسان کے دل و دماغ کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، یعنی جدیدیت کے بعد سیکولرزم اور اسلام- ان کے علاوہ کوئی تیسرا متبادل نظر نہیں آتا اگرچہ مغربی دانشوروں میں خال خال ایسے افراد بھی ہیں جو بدھ مت میں کشش محسوس کرتے ہیں، مگر وہ شاید کسی دوسرے جنم میں ایک اور موقع کے متمنی ہیں لہٰذا اب نہایت اہم سوال یہ ہے کہ مستقبل کس کا ہوگا؟۔

علاوہ ازیں کوئی نتیجہ نکالنے سے پہلے اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈنا ہوگا کہ کیا ۲۱ ویں صدی مذہبی ہوگی یا نہیں؟

موجودہ دور میں بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ مذاہب معاشرے سے خارج ہو رہے ہیں اور یہ کیفیت امریکہ سے زیادہ یورپ میں پائی جاتی ہے۔ لوگ گروہ در گروہ مسیحی چرچوں کو خیر باد کہہ رہے ہیں۔ یہ چرچ بھی ہمارے عہد کے مزاج اور فیشنوں کے مطابق یکے بعد دیگرے مصالحتیں اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ہم جنس پرست پادری پیدا ہو چکے ہیں، لوگ جب اور جیسے چاہیں اسقاط حمل کی اجازت لے سکتے ہیں، خواتین بشپ بھی ہیں اور روزہ رکھنے کی عملاً کوئی مدت

مقرر نہیں۔ یقین کیجیے اس طرح چرچ تیزی سے منحرف ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اب یہ تعجب کی بات نہیں کہ مسیحیت میں ایمان رکھنے والوں کی اکثریت (حتیٰ کہ بعض پروٹسٹنٹ پادری بھی) حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت یا موت کے بعد بعثت میں کوئی یقین نہیں رکھتی۔

بہر حال یہ صورت حال کی مکمل تصویر نہیں، ابھی تک نجی رویوں کے تابع اور بے قاعدہ مذہب ادھر ادھر پھیلا ہوا موجود ہے۔ مذہب مسلمہ چرچوں سے ہٹ کر اپنے وجود کے لیے نئے سہارے تلاش کر رہا ہے۔ آپ مغربی دنیا کی کسی بک شاپ میں چلے جائیے، آپ دیکھیں گے کہ مذہب کے مقابلے میں اسرار و طلسمات پر مشتمل کتب کا سیکشن کہیں بڑا ہوگا۔ لوگ آج بھی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل کیا ہے؟ وہ ہر قسم کے رازوں کو جاننا اور خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بنیادی طور پر انہی مذہبی خواہشوں نے تمام صنعتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔ لوگ کسی بھی چیز کا تجربہ کرنے کے لیے آمادہ ہیں خواہ وہ شمن پرستی ہو جنتر منتر، یا شیطان پرستی (Satanic cult) ہو، منشیات کے زیر اثر خیالی سفر ہوں کہ ہندو گورو۔

میری تشخیص یہ ہے کہ یہ لوگ جن کی اکثریت نئی نسلوں سے تعلق رکھتی ہے، تلاش مذہب میں سرگرداں ہیں۔ بے معنویت اور روحانیت سے خالی زندگی سے ان کا دل اچاٹ ہو چکا ہے اور وہ حقیقت کی تلاش ایک ایسی دنیا میں کر رہے ہیں جہاں سب چلتا ہے۔ ان کی پرورش پابندیوں سے آزاد ماحول میں ہوئی ہے اور ان کے دلوں میں قیادت، حقیقی اقدار اور حق و باطل کے قابل اعتماد معیارات کو پالینے کی شدید خواہش موجزن ہے۔

مختصر یہ کہ ان لوگوں میں بے پناہ مذہبی امکانات موجود ہیں، جو اکیسویں صدی کو دیندار بنا سکتے ہیں۔

اسلام۔ بطور متبادل؟

چنانچہ سوال یہ ہے کہ کیا ماضی کی نسبت آج عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کو بہتر متبادل

تصور کیا جائے گا یا نہیں؟ اور کیا اس وقت رائج نجی نوعیت کے مذہب کے مقابلے میں اجتماعی عبادت کو ترجیح دی جائے گی یا نہیں؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ یورپ میں مسیحیت ناقابل اصلاح ہے۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ اہل مغرب ایک نئے مصنوعی مذہب--- یہاں وہاں سے لیے گئے اجزا کے مرکب ''اسپرانتو'' مذہب--- کے تحت بھی اپنی کوششوں کو یک جا نہیں کر سکتے۔ ایسا مذہب چل نہیں سکے گا اس لیے کہ مذہب کے لیے ایک ایسی غالب ہستی کا تصور ناگزیر ہے جو شک شبے سے بالا ہو۔ صرف وحی والہام پر مبنی مذہب ہی کے ذریعہ ایسا ممکن ہوگا۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے میں زیادہ پرامید ہوں۔ نوجوان نسل آپس کے تعلقات کو عزیز رکھتی ہے اور بڑھاپے میں تنہائی اور مجرد زندگی کے تصور کے بارے میں بہت فکرمند ہے۔ فی الواقع یہ نوجوانوں کا ایک اہم اثاثہ ہے کہ اسلام اپنے ساتھ خاندان، امت اور اخوت کے تصورات لاتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں مغربی مسیحیوں کے درمیان اپنے ہمسائے سے محبت کے تصور کے مقابلے میں مواخات اور خونی رشتے کہیں زیادہ حقیقی طور پر قائم ہیں۔ اگر مغربی معاشروں کی جذباتی سرد مہری (موعودہ ''امریکی سرسبزی'' نہیں) ایک حقیقت ہے تو اسلامی امہ کی محبت اور گرم جوشی ہم عصر مغربی نوجوانوں کی ایک بنیادی ضرورت پوری کر سکتی ہے۔

کمپیوٹر دور کی دروں بین فطرت، جنسی لحاظ سے مشتعل ماحول اور مغربی زندگی میں مقابلے کی وحشیانہ دوڑ جو سکول سے ملازمت اور اس سے آگے جنسی تعلقات تک میں جاری رہتی ہے، اور ''تکاثر'' کی بے تکان دوڑ نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے جس میں ہر عام امریکی کم از کم ایک بار نفسیاتی معالج سے مشورے پر مجبور ہے۔ ایسے لوگ اس بدیہی حقیقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمانوں کی اکثریت اپنی ذات میں مطمئن، نفسیاتی بوجھ سے بے نیاز ہے اور عجلت پسند نہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے اللہ کی رضا پر راضی اور اپنے ماحول اور اپنی ذات سے

مطمئن لوگ ہیں۔ ان تمام اسباب کی بنا پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بہت سے لوگ جو اپنی روزمرہ زندگی کی مسلسل بھاگ دوڑ سے تنگ آ چکے ہیں، اسلام کے بارے میں زیادہ جاننے کی جانب مائل ہوں گے۔

اسلام کے امکانات

اس سوال کا جواب کہ کیا لوگ اسلام کو دریافت کر سکیں گے یا نہیں، اس بات پر منحصر ہے کہ مسلمان اپنے اسلام کو درست طور پر پیش کرتے ہیں یا اس کی غلط ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی جنہیں چاہتا ہے سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔ سان فرانسسکو کے جیفرے لینگ اسی طرح بہت سے نومسلم صرف قرآن کریم پڑھ کر مسلمانوں کے حلقے میں شامل ہو گئے حالانکہ اس سے قبل ان کا مسلمانوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا لیکن بحیثیت مجموعی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہی داعی کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

پہلے میں اس بات پر بحث کرنا چاہوں گا کہ مسلمانوں کو اشاعت اسلام کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اس تجویز کو ایک جملے میں سمیٹا جا سکتا ہے: اسلام کو مغربی معاشرے اور تہذیب کی صحت مندی کے لیے ایک اہم علاج کے طور پر پیش کیجیے--- ان امراض کے مداوا کے طور پر جو مغرب کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پورے ادعا اور فعال انداز میں دعوت پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ معذرت خواہانہ اور مدافعانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ دعوت کا انداز ایسا نہیں ہونا چاہیے جیسے کوئی چیز طلب کی جا رہی ہے بلکہ ایسا ہونا چاہیے جو کسی کو کچھ پیش کرتے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔

اور دینے کے لیے ان باتوں کے علاوہ جن کا ذکر میں قبل ازیں کر چکا ہوں، ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔

(الف) مسلمانوں کا تصور الٰہ، بے مثل خدائے واحد کا تصور، جو بیک وقت ہر کہیں موجود

ہے لیکن سب سے ماورا ہے، جو حدود زمان و مکان میں مقید نہیں۔ وہ واحد ہستی جو مطلق وجود رکھتی ہے۔ اللہ کا یہ وہ یکتا تصور ہے جو جدید تعلیم یافتہ انسان کو مطمئن کر سکتا ہے۔ توحید یعنی ہر آلائش سے پاک یہ تصور کہ اللہ ایک ہے، ہمارا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔

(ب) ہمارے حال کا مشاہدہ ہے کہ دنیا کی کوئی تہذیب خاندان کا ڈھانچہ ٹوٹ جانے کے بعد دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ موجودہ دور میں بالفعل خاندان شدید حملے کی زد میں ہے اور خ ریاست بھی غیر ازدواجی تعلقات کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن تدبیریں کر رہی ہے۔ طلاق کی شرح خوفناک حد تک بڑھ چکی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں آدھے گھر مجرد افراد چلا رہے ہیں جن میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو بچہ تو چاہتی ہیں، شوہر نہیں۔ بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد بن باپ پرورش پا رہی ہے۔ بہت سے بچے عدم توازن کا شکار ہیں، جس کا اندازہ تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے دل میں بزرگوں اور خاندان کا احترام اتنا کم ہو چکا ہے کہ اب امریکہ میں ناپسندیدہ والدین سے نجات کے لیے بچے قانونی دعویٰ بھی کر سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ گلوبلائزیشن، اقتصادی مجبوریوں اور ٹیلی ویژن کے زیر اثر مسلمان خاندان بھی شدید دباؤ میں ہیں۔ تاہم عمومی طور پر مسلمان خاندان مضبوط تانے بانے میں منسلک ہیں اور عام مغربی گھرانوں کے مقابلے میں زیادہ تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے اس اثاثے کا تحفظ کرنا چاہیے۔

(ج) مغربی معاشرے کو اپنے وجود میں دوسرا بڑا خطرہ ہر قسم کی منشیات سے درپیش ہے، جن میں سگریٹ، شراب، کوکین، ایل ایس ڈی اور دوسری نشہ آور ادویہ شامل ہیں، بلکہ ٹی وی اور انٹرنیٹ کو بھی ان میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ کسی مبالغے کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی معاشرہ کاملاً نشئی ہو چکا ہے۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ لوگ، ''یہ'' جام، ''وہ'' گولی اور ''اس'' سگریٹ کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ایسے لوگ بالفعل شرک کی ایک جدید قسم پر عمل پیرا ہیں۔ وہ خدا کے سوا کسی دوسری چیز

کے بندے بن چکے ہیں اور اگر کہیں انہیں روزے کے قواعد کی پابندی کرنی پڑے تو یہ بات اور واضح ہو جائے گی۔ وہ ایسا نہیں کر سکیں گے اس لیے کہ انہیں اپنے وجود پر کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔

مسلمان اس امر پر فخر کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے وجود میں سنجیدہ فطرت ہیں۔ وہ ہر لمحے مستعد اور چوکس رہتے ہیں۔ کبھی مخمور نہیں ہوتے نہ ان کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ نشے کے زیر اثر مہلک حادثات کے قصوروار نہیں ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی دوسری بات اتنی صراحت کے ساتھ یہ ثابت کر سکے گی کہ اسلام ایک متبادل طرز حیات ہے جو مغرب کو حالت نیم خوابیدگی میں تباہی سے دوچار ہونے سے بچا سکتا ہے۔

(د) تمام مغربی معاشروں کو اپنے اندر مختلف قسم کے گروہی تعصّبات، نسل پرستی، شاونزم اور دوسرے مذاہب کے خلاف امتیازی سلوک جیسے خطرات لاحق ہیں۔ کالے غلاموں کی تاریخ کا آج بھی امریکہ میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ماضی قریب تک جتنی جنگیں یورپ اور امریکہ میں لڑی گئیں وہ اسی قسم کے تعصبات کی وجہ سے برپا ہوئیں۔

اس پس منظر میں جب ذمہ دار مغربیوں کو معلوم ہوگا کہ اسلام کم از کم نظری اور بیشتر عملی اعتبار سے ایک ایسا مذہب ہے جس نے رنگ و نسل کی بجائے تقویٰ کو معیار بنا کر، ہر انسان کو امت میں قبول کر کے اور خلوص دل سے دوسرے مذاہب کو برداشت کر کے نسل پرستی اور کثیر المذاہب معاشرے کا مسئلہ حل کر دیا ہے، تو وہ اسے جنت گم گشتہ خیال کریں گے۔ جب میلکم ایکس کو معلوم ہوا کہ امت میں سب نسلیں شامل ہو سکتی ہیں، تو اس کے لیے یہ ایک بڑا انکشاف تھا۔

آیئے ہم اس خیر کو عملی زندگی کا حصہ بناتے ہوئے اپنی صفوں میں رنگ، نسل، زبان اور اسی طرح کے دوسرے امتیازات کو مٹا ڈالیں اور اس سے بہترین فائدہ اٹھائیں۔ امریکہ کے لاکھوں افریقی النسل لوگوں نے اول و آخر اسی لیے اسلام قبول کیا کہ حضرت بلالؓ سیاہ فام تھے۔ دوسرے لاکھوں لوگ بھی اسی جذبے سے کیوں نہ ان کی پیروی کریں؟۔

بین المذاہب رواداری کا منشور بھی اسی طرح مساوی افادیت کا حامل ہے، جسے سورۃ المائدہ کی آیت ۴۸ اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۶ میں بیان کیا گیا۔ یہ بنیادی رواداری جس پر جدید عالمی مسیحی اتحاد کی تحریک سے ۱۴۰۰ برس پہلے عمل کیا گیا، مغربی لوگوں کی نظر میں اس قدر غیر معمولی ہے کہ ان کے لیے اس کی تحسین کیے بغیر چارہ نہیں۔

ہماری جانب سے بس اتنی بات کی نشاندہی کرنے کی ضرورت ہے کہ ترکوں کی حکمرانی کے دور میں ۵۰۰ برس تک یونان آرتھوڈکس عیسائی رہا۔ اس کے بعد سوال اٹھایئے کہ آٹھ سو برس تک سپین میں بسنے والے مسلمان کہاں غائب ہو گئے۔؟

(ر) نوجوان نسل اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتی ہے اور اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ وہ نظام مراتب اور وراثت میں ملنے والی پیشوائی، مذہبی رسوم پر مامور پادریوں، پراسرار عقائد اور ہر اس چیز سے نفرت کرتی ہے جو انہیں چرچ کے اداروں کی یاد دلاتی ہے۔

ایسے لوگ اس وقت خوشگوار حیرت میں گم ہو جاتے ہیں جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام چرچ، پوپ، رسوم اور تجسیم خداوندی، تثلیث، صلیب پر نجات اور موروثی گناہ جیسے پریشان کن تصورات کو بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ پابندیوں سے آزاد اہل ایمان کوئی اور نہیں تو وہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ کوئی درمیانی وسیلہ قبول نہیں کرتے، خواہ وہ پادریوں اور بزرگوں کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو جبکہ وہ اپنی عبادت میں مکمل انفرادی حیثیت میں اللہ کے روبرو پیش ہوتے ہیں۔ وہ یقیناً اس خبر سے بھی بہت متاثر ہوں گے کہ ہر مسلمان اپنے مقام و مرتبے سے قطع نظر امام کے فرائض انجام دینے کا اہل ہے۔

(ز) شاید آپ کو یہ بات سن کر حیرانی ہو کہ جنسی معاملات میں مسلمانوں کا ضابطہ آج کل بہت سے نوجوانوں کو جو ''اقدار کی قدامت پسندی'' کے جدید نظریے کی جانب جھکاؤ رکھتے ہیں مثبت طور پر متاثر کرتا ہے۔ متعدد مغربی خواتین جو گلیوں، بازاروں میں سامان جنس کے طور پر

مردوں کا نشانہ بننے کو توہین آمیز سمجھتی ہیں، ان مسلمان عورتوں کی مداح ہیں جن کا لباس اور رکھ رکھاؤ واضح اشارہ دے رہا ہوتا ہے کہ وہ کوئی آسان شکار نہیں۔ فحش لٹریچر اور فلموں، فیشن شو، حسن کے مقابلوں اور عریاں جنسی اشتہارات سے جس طرح عورت کا استحصال کیا جارہا ہے اس صورت حال میں آزادی نسواں کی حامی بہت سی مغربی خواتین بھی اب سمجھنے لگی ہیں کہ ان کی مسلمان بہنیں بھی اسی مقصد یعنی عورت کے وقار کے لیے جدوجہد کررہی ہیں اور وہ یہ کام زیادہ کامیابی سے انجام دے رہی ہیں۔

اسقاط حمل کے بارے میں مسلمانوں کے اس موقف کو کہ اس کی اجازت صرف اسی صورت میں دی جاسکتی ہے، جب ماں کی زندگی خطرے میں ہو، ''حامئ حیات'' مغربی حلقوں میں بڑے احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ حلقے اس امر پر نالاں ہیں کہ کیتھولک بشپ بھی ہر طرح کی وجوہ کی بنیاد پر اسقاط حمل کی اجازت دینے لگے ہیں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام بچے کی زندگی کے حق میں قطعی واضح موقف کا حامل ہے۔

مغرب کی خاموش اکثریت ہم جنس پرستی کے خلاف بھی مسلمانوں کے موقف کا احترام کرتی ہے۔ یہ خاموش اکثریت مغرب کی نئی پالیسی کی مذمت کرتی ہے، جس کے تحت ایک ہی جنس کے افراد کے باہمی تعلقات کو ایک طرز زندگی سمجھ کر قبول کرلیا گیا ہے۔ مغرب کے بہت سے دانشوروں کو خدشہ ہے کہ عوامی سطح پر ہم جنس پرستی کا مرتبہ بڑھانا، جس میں ہم جنسوں کی باہمی تزویج بھی شامل ہے، انحطاط اور زوال تہذیب کی علامت ہے۔ یہ لوگ اس بات پر شرم محسوس کرتے ہیں کہ سان فرانسسکو میں شہر کے دو حصے خالص ہم جنس پرستوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے لوگ مسلم رویے کو پسند کرتے ہیں جس کے تحت نام نہاد ''پیدائشی'' ہم جنس پرستوں کو تو قابل رحم سمجھا جاتا ہے لیکن ہم جنس پرستی کو زندگی کا معمول تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے۔

مغرب میں بیک وقت دو انتہائی رویے نظر آتے ہیں۔ ایک جانب جنس اور شادی تک سے مکمل اجتناب ہے تو دوسری جانب معاشرتی امتناع سے بے خوف اور بے لگام جنسی آزادی۔ اسی لیے مغرب کے صاحب نظر لوگ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے متاثر ہیں جو مرد کی جنسی جبلت اور ضرورت کے بارے میں زیادہ متوازن اور باوقار ہے۔ اسلام شادی کے تقدس کو عیسائیت کی رسمی سطح پر نہیں لے جاتا بلکہ عقل سلیم کے مطابق یہ سمجھتا ہے کہ یہ معاہدہ ممکنہ طور پر غیر مستقل بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام فریقین کے درمیان متاہل زندگی کو عبادت قرار دیتا ہے۔ وہ سارے لوگ جو مرد کی فطری ضرورت کا احساس رکھتے ہیں جنس و تزویج کے ضمن میں اسلامی طرز عمل کی معقولیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

(س) اقتصادیات کے میدان میں بھی اسلام کو باعث رحمت سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلی نظر میں ربا کی ممانعت بے معنی اور ناقابل عمل لگتی ہے۔ لیکن بغور دیکھنے سے وہ قائل ہو سکتے ہیں کہ یہ ممانعت نجی کاروبار کو، جس پر سرمایہ داری کی عمارت تعمیر کی گئی ہے، تحفظ فراہم کرسکتی ہے۔ وہ یوں کہ جب سرمایہ بیشتر نقصان سے محفوظ کاروبار میں ہی صرف کیا جانے لگتا ہے تو جمود اور ارتکاز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اسلام نفع و نقصان کی بنیاد پر کاروبار پر زور دے کر سرمائے کے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے[۲]۔

(ش) اسلام کے کئی اور پہلو بھی مغربی لوگوں کے لیے باعث کشش ہو سکتے ہیں جن میں صحت کے اعتبار سے رمضان کے روزے بھی شامل ہیں۔

لیکن آخری تجزیے میں یہ عوامل مغرب اور مشرق کے درمیان سب سے زیادہ اہم اختلاف کی صورت میں سمٹ جاتے ہیں: یعنی معیار زندگی جس کے بارے میں کمیت اور ماہیت کے اعتبار سے دونوں کے رویے مختلف ہیں۔ مغرب واضح طور پر مقداری پہلو کو اس حد تک عزیز رکھتا ہے کہ جب تک کسی چیز کے وزن یا اس کے شمار کا تعین نہ کیا جائے، وہ اس کے نزدیک کسی قدر و قیمت کی

حامل نہیں۔ فی الحقیقت مغرب میں ان اقدار سے انکار کا رجحان عام ہے جن کی مادی مقدار (مادی پہلو) کا تعین نہیں کیا جا سکتا اور وہ صرف روحانی سچائیاں ہیں۔

اسلامی دنیا سمیت مشرق اشیائے صرف کی چاشنیوں کی طرف راغب ہے، جو گلوبلائزیشن کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ رہی ہیں لیکن اس خطے میں زندگی کی کوالٹی کے پہلوؤں کو مقداری پہلو کے مقابلے میں آج بھی زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

زندگی کی کوالٹی جس میں سکون قلب، فرصت، غور و فکر، دوست داری اور مہمان نوازی شامل ہیں اور جو اسلام کا خصوصی مطمح نظر ہے، مغرب کے بہت سے لوگوں کے لیے باعث توجہ ہونی چاہیے جو احمقانہ مادیت سے خوفزدہ ہیں۔

راہ کی رکاوٹیں

جیسا کہ ہم نے دیکھا اسلام کو متعدد وجوہ کی بناء پر مغرب کی بیشتر کمزوریوں کا تریاق سمجھا جانا چاہیے۔ چنانچہ اسلام ۲۱ ویں صدی میں رہنما آئیڈیالوجی بن سکتا ہے۔

لیکن بعض عوامل ایسے بھی ہیں جو مخالف سمت میں کام کر رہے ہیں۔ مسلمان ابھی تک کسی بھی جگہ ایک حقیقی مسلم معاشی نظام قائم نہیں کر سکے۔ جمہوریت، انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق جیسے فیصلہ کن مسائل پر بھی مسلمانوں کی پوزیشن ابھی تک ابہام کا شکار ہے اور ان کے تعلیمی نظام کئی پہلوؤں سے اب تک دور وسطیٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔

علاوہ ازیں، اکثر مسلمانوں کا طرز عمل ان کی دعوت و تبلیغ کی کوششوں کے برعکس ہے۔ مغرب میں آ کر بسنے والے بہت سے مسلمان، خصوصاً وہ جو ان پڑھ ہیں، اپنے عقیدے کو پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

نتیجتاً وہ خستہ حال بستیوں (ghettos) کی شکل میں نسلی گروہوں کی صورت میں رہنے لگتے ہیں۔ اپنے وطن کی ثقافت، اس کی خوراک، لباس، موسیقی، معاشرتی رسم و رواج اور زبان کے تحفظ

کے لیے وہ اپنے قومی تصورات اور رسم ورواج کے مجموعے کو اسلام کے طور پر پیش کرنے لگتے ہیں۔ جس سے صرف انہی کے ماحول کو دلچسپی ہوسکتی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر نقل مکانی کرنے والے بہت سے لوگوں کی اصل دلچسپی اپنے آبائی ملک سے ہوتی ہے، جہاں وہ جلد سے جلد لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ جرمنی میں آباد ایک ترک جو ترکی میں اسلام کا احیاء چاہتا ہے بلاشبہ میزبان ملک میں دعوتی کاموں کے لیے کارآمد نہیں رہتا۔

جہاں تک ان چند لوگوں کا تعلق ہے جو مغرب میں اشاعت اسلام کی کوششیں کررہے ہیں، وہ اکثر سخت گیر اور ظواہر کے اتنی سختی سے پابند ہوتے ہیں کہ مغربی لوگ ان میں روحانیت کے عدم وجود سے چونک اٹھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ظاہری شکل وصورت کو اصل پر فوقیت دی گئی ہے اور اکثر فروعی مسائل کو بنیادی اور مرکزی موضوعات کے برابر اہمیت دی جاتی ہے۔

ان تمام وجوہ کی بناء پر مہمان مسلم کارکن مذہب کے حوالے سے اپنے مغربی پڑوسیوں پر بہت کم اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور بڑا عامل جو اسلام کو غالب آنے سے روکتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان بآسانی حقائق سے منہ موڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ایک بیمار آدمی کو (اور مغرب بیمار ہے) نہ صرف یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ بیمار ہے، بلکہ اسے تجویز کردہ گولی میز پر رکھ دینے کے بجائے نگلنا بھی چاہیے۔ بصیرت کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ عمل کی متبادل نہیں بن سکتی۔ سابق جرمن صدر رومن ہرزوگ کے بہ قول: ''ہمارا مسئلہ دانش وادراک کا نہیں، عمل کا ہے۔''

قرآن میں ان قدیم اقوام کی کہانیاں بکثرت بیان کی گئی ہیں جنہوں نے نوشتۂ دیوار پڑھنے سے انکار کردیا اور تنبیہات پر کان نہ دھرا حتیٰ کہ ان کی تہذیبیں المناک انجام کو پہنچ گئیں۔ عین ممکن ہے کہ ہم عصر مغربی دنیا بھی تباہی تک پہنچنے سے قبل اپنا راستہ تبدیل کرنے اور اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کا حوصلہ اور عزم پیدا نہ کرسکے۔ اگر ایسا ہوا تو حال ہی میں کمیونزم پر فتح پانے کے بعد،

مغرب پر بھی خود فراموشی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہو جائے گی جس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ تب مغربی دنیا اپنے اندرونی تضادات کا شکار ہو گی جن میں سے سب سے زیادہ مہلک یہ ہے کہ انسان کو دیوتا بنالیا گیا ہے۔

ہلاکت مغرب کا ناگزیر انجام ہے۔ اگر وہ اس انجام سے بچنا چاہتی ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ از سرِ نو وجود باری تعالیٰ کی مقدس اور الہامی حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد قرآن میں وحی کردہ مطلق اقدار اور احکام الٰہی (جنہیں اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے مستحکم کر دیا گیا ہے) کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کر دے۔ واللہ الاعلم

حواشی

۱۔ ڈاکٹر مراد ہوف مین نے جیفرے لینگ کی مندرجہ ذیل کتب کے مطالعے کی پرزور سفارش کی ہے:

I. *Struggling to Surrender* (1994)

II. *Even Angles Ask* (1997)

یہ دونوں کتابیں ''امانہ پبلی کیشنز'' نے امریکہ سے شائع کی ہیں (Amana Publishing in Beltsville, MD. USA)

[ان میں سے پہلی کتاب کا اردو ترجمہ ''سرِ تسلیم خم ہے'' کے عنوان سے ڈاکٹر تصدق حسین راجا نے کیا ہے جسے مکتبہ دانیال حیدر راجا، ۱۱۴-اے، سٹریٹ ۵۵، جی ۱۰/۳، اسلام آباد نے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا ہے۔ (مرتب)]

۲۔ ربا کے موضوع پر دیکھیے:

Khurshid Ahmad, *Elimination of Riba from the Economy*, Institute of Policy Studies, Islamabad, 1994.

اور

Umer Chapra, *Islam and the Economic Challenge*, Herndon, VA, USA, 1992.